حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

سید عمر فاروق مودودی

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دَور میں احیاے نظامِ اسلامی کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا' اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ایک مختصر سی طائرانہ نظر اُن سے ماقبل کے دَور پر ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آخر ان کے دَور میں نظامِ اسلامی کے احیا کا سوال ہی کیوں پیدا ہوا اور مؤرخین نے ان کے دور کو تجدید و اصلاح کے دَور کی حیثیت سے کیوں دیکھا اور خود ان کو ایک مجدد اور مُصلح کا مقام و مرتبہ کیوں دیا---؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام نے جو حالات پیدا کر دیے تھے ان کے نتیجے میں وہ قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور خلافتِ راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے' نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نوخیز عربی نسل میں پوری طرح اُبھر آئے۔ حکومت کا محور جس پر اُس کا نظام گردش کرتا تھا' کتاب و سنت نہ رہا بلکہ عربی سیاست اور مصالحِ ملکی بن گیا۔ تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے بالکل مُضمحل کر دیا تھا' دوبارہ تندرست و توانا ہو کر مسلم معاشرے میں در آئی۔ قبائلی غرور اور خاندانی عصبیت جو خلفاے راشدین کے زمانے میں سخت عیب اور معصیت سمجھی جاتی تھی' ایک خوبی کے طور پر معاشرے میں پوری طرح رچ بس گئی۔ بیت المال ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا۔ عدالتوں میں امیر اور غریب اور صاحبِ اقتدار اور بے کس میں امتیاز برتا جانے لگا۔ خلافت کا مزاج اس لحاظ سے تو بدلا ہی تھا کہ وہ جمہور کی آزاد مرضی سے منعقد ہونے کے بجاے خاندانی میراث کے طور پر باپ سے بیٹے کو منتقل ہونے لگی' لیکن اس کے ساتھ ہی بلکہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر حکمران عوام سے دُور ہوتے چلے گئے۔ عوام کے لیے آزادی کے ساتھ اپنے حکمرانوں کی خدمت میں پہنچ کر اپنی شکایات پیش کرنا ناممکن ہوگیا۔ ظلم اور جبر کا چلن عام ہوگیا' بات بات پر واں زبان کٹنے لگی۔ پیشہ ور شعرا' خوشامدی درباریوں اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا جس پر مسلمانوں کی دولت بے دریغ صرف ہوتی تھی اور ان کی بدعنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔ گانا سننے کا ذوق اور موسیقی میں انہماک حد کو پہنچ گیا تھا۔ الغرض ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے اور ۴۰ برس کا حساب چند روز میں چکانا چاہتی ہے۔

بطور خلیفہ تقرری

ان حالات میں صَفر ۹۹ھ میں سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہوتا ہے اور اس کی وصیت کے نتیجے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز سریرآراے خلافت ہوتے ہیں۔ آپ مصر کے گورنر عبدالعزیز بن مروان کے بیٹے اور مروانی خاندان کی سلطنت کے معمارِ اول عبدالملک بن مروان کے بھتیجے اور داماد تھے اور خود ایک عرصے تک مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ آپ کی زندگی بڑے ٹھاٹ باٹ اور آن بان کی زندگی تھی۔ اچھا کھاتے تھے' اچھا پہنتے تھے اور ناز و نعمت میں رہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ عمر بن خطابؓ کے نواسے بھی تھے۔

بچپن میں آپ نے مدینہ منورہ کی پاک فضا میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دامنِ فیض میں تربیت پائی تھی اور اپنے وقت کے امام صالح بن کیسان سے حدیث اور تفسیر کا علم حاصل کیا تھا۔ یہ چیزیں اثر کیے بغیر نہ رہ سکیں اور خلافت ملتے ہی آپ کی زندگی میں عظیم الشان تغیر واقع ہوا۔

سلیمان بن عبدالملک کی تجہیز و تکفین کے بعد جب آپ کے سامنے شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے اسے واپس کر دیا اور فرمایا: "میرے لیے میرا خچر کافی ہے"۔ اس کے بعد شہر کا کوتوال نیزہ لے کر آپ کے آگے آگے چلنے لگا تو آپ نے اسے بھی روک دیا اور کہا: "میں بھی تمام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں"۔

گھر پہنچے تو فکر اور تردد سے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اہلیہ محترمہ نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا: "اس سے بڑھ کر فکر و تشویش کی بات کیا ہوگی کہ مشرق و مغرب میں اُمت محمدیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبے اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو"۔

آپ کی خلافت چونکہ وصیت کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی اور مرضی جمہور کا اس میں دخل نہ تھا اس لیے آپ غور و فکر کے بعد خلافت سے دست برداری پر آمادہ ہو گئے۔ مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا:

لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمھاری گردن میں ہے، میں خود اُسے اُتارے دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرو۔

لوگ جانتے تھے کہ تمام بنی اُمیہ میں آپ سب سے بہتر آدمی ہیں۔ اس لیے وہ بہ یک آواز بول اُٹھے: "ہم سب آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیجیے"۔

اصلاحِ حکومت

اس طرح جب آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ کسی کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں ہے تو آپ نے اس بارِ عظیم کو قبول فرمایا اور خلیفہ کی حیثیت سے عوام کے سامنے پہلی تقریر کی۔ آپ نے فرمایا:

اما بعد۔ تمھارے نبیؐ کے بعد دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے، اور اللہ نے اس پر جو کتاب اُتاری ہے اس کے بعد دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے۔ اللہ نے جو چیز حلال کر دی وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جو حرام کر دی وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں۔ خود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض پیرو ہوں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں کا کوئی ممتاز آدمی بھی نہیں ہوں بلکہ معمولی فرد ہوں۔ البتہ تمھارے مقابلے میں اللہ نے مجھے زیادہ گراں بار کیا ہے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے اس خطاب میں دستوری نوعیت کے نکات بھی پیش کیے ہیں، حکومت کی حدود بھی قائم کی ہیں اور حکمران کی حیثیت کا تعین بھی کیا ہے اور یہ فرما کر کہ "میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ فیصلوں کو نافذ کرنے والا ہوں اور میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض پیرو ہوں" --- حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان مختصر سے فقروں میں خلیفہ کی آئینی حیثیت کی وضاحت کر دی، یعنی خلیفہ ایک انتظامی سربراہ ہے، مطلق العنان حکمران نہیں۔ فیصلے کرنا شوریٰ کا کام ہے۔ خلیفہ کا کام شوریٰ کے فیصلوں کا نفاذ ہے اور وہ شریعت میں کسی کمی بیشی یا کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو قانون اسے جس حال میں ملا ہے وہ اس کی سیدھی سیدھی پیروی کرتا رہے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تقسیم اختیارات کا جو اصول بیان فرمایا ہے اس کو آپ نے اپنے زمانہ خلافت میں عملاً جاری بھی کیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفاء میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہر صوبے میں مستقلاً اپنی طرف سے تین نمایندے بھیجتے تھے۔ ایک والی، دوسرا قاضی اور تیسرا افسر خزانہ۔ حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تینوں عہدے کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر ایک براہِ راست خلیفہ کے سامنے جواب دہ تھا۔

جاگیروں کی واپسی

اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سلطنت کے ہر شعبے میں کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کا عمل شروع کر دیا۔ سب سے مقدم فرض رعایا کے کمزور اور زیردستوں کے اس مال و جایداد کی واپسی تھی جسے شاہی خاندان کے ارکان، اموی گورنروں، امرا اور وزرا نے طاقت کا سہارا لے کر غصب کر لیا تھا۔ یہ ایسا نازک کام تھا جس کو ہاتھ لگانا سارے شاہی خاندان کی دشمنی مول لینا تھا۔ لیکن آپ نے پوری بے خوفی کے ساتھ اہل خاندان کو جمع کر کے فرمایا:

> **بنی مروان! تم کو شرف اور دولت کا بڑا حصہ ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُمت کا نصف یا دو تہائی مال تمھارے قبضے میں ہے۔**

ان لوگوں نے جواب دیا کہ ''اللہ کی قسم! جب تک ہمارے سر تن سے جدا نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ جایدادیں واپس نہیں ہو سکتیں، نہ ہم اپنے آبا و اجداد کو کافر بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کو مفلس بنائیں گے''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا:

> **اللہ کی قسم! اگر اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تم کو ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑوں گا۔**

اس کے بعد آپ نے عام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے فرمایا:

> **ان لوگوں (یعنی اموی خلفا) نے ہم ارکانِ خاندان کو ایسی جاگیریں اور عطیے دیے جن کے دینے کا ان کو کوئی حق نہ تھا اور نہ ہمیں ان کے لینے کا کوئی حق تھا۔ اب میں ان سب کو ان کے اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں اور اس کی ابتدا اپنی ذات اور اپنے خاندان سے کرتا ہوں۔**

اس تقریر کے بعد آپ نے جاگیروں کی اسناد کا رجسٹر منگوایا۔ آپ کا سیکرٹری اسناد پڑھتا جاتا تھا اور آپ انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے۔ صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی تمام ناجائز منقولہ اور غیر منقولہ املاک واپس کر دی۔ حتیٰ کہ اپنے پاس ایک نگینہ تک نہ رہنے دیا۔ آپ کی بیوی فاطمہ کو ان کے باپ عبدالملک نے ایک قیمتی ہیرا دیا تھا۔ آپ نے ان سے کہا کہ یا تو اسے بیت المال میں داخل کر دو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ ہیرا اسی وقت بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ انھی جاگیروں میں فدک کا علاقہ بھی تھا جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بیت المال کی مِلک قرار دے دیا تھا اور حضرت فاطمہؓ کو بھی نہیں دیا تھا۔

اس فدک کے علاقے کو مروان نے اپنی جاگیر بنالیا تھا۔مروان کی موت کے بعد وہ وراثتاً منتقل ہوتا ہوا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حصے میں آیا۔لیکن جب آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیریں واپس کیں تو اسے بھی واپس کر دیا اور بنی مروان سے فرمایا کہ ”فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھا جس کی آمدنی آپؐ اپنی اور بنی ہاشم کی ضروریات پر صرف فرماتے تھے۔فاطمہؓ نے اسے آپؐ سے مانگا تھا لیکن انھوں نے نہیں دیا۔ پھر مروان نے اسے اپنی جاگیر بنالیا اور اس طرح وہ وراثتاً میرے قبضے میں آیا۔لیکن جو چیز رسولؐ اللہ نے فاطمہؓ کو نہیں دی اس پر میرا کوئی حق نہیں ہوسکتا۔اس لیے میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو صورت رسولؐ اللہ کے زمانے میں تھی، میں اس کو اسی حالت پر لوٹاتا ہوں“۔

اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں کو واپس کرنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ عام غصب شدہ اموال کی واپسی کی طرف متوجہ ہوئے اور گورنروں کے پاس تاکیدی احکام بھیج کر تمام ممالک محروسہ (وہ ممالک جو کسی بادشاہ کے تابع ہوں) کے غصب شدہ مال واملاک کو واپس کرایا۔عراق میں اس کثرت سے مال حق داروں کو واپس کیا گیا کہ وہاں کا خزانہ خالی ہوگیا اور آپ کو عراق کی حکومت کے اخراجات کے لیے مرکز سے روپیہ بھیجنا پڑا۔ملکیت کے ثبوت کے لیے بھی آپ نے بڑی سہولت رکھی تھی۔معمولی شہادت پر مال واپس مل جاتا تھا، اور جو لوگ مر چکے تھے ان کے ورثا کو ملتا تھا۔یہ سلسلہ آپ کی وفات تک برابر جاری رہا۔

ناجائز آمدنی اور رشوت ستانی کا انسداد

اموی حکمرانوں نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنالیا تھا۔اس کی آمد وخرچ میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز نہیں برتی جاتی تھی۔بیت المال کا بڑا حصہ ان کے ذاتی تعیّشات پر صرف ہوتا تھا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام ناجائز مصارف یک قلم بند کر دیے۔اموی امیر زادوں اور شہزادوں کو جو وظائف ملتے تھے، سب روک دیے۔ایک ایسے ہی وظیفہ خوار عینیہ ابن سعد نے آپ سے شکایت کی کہ امیر المومنین آپ پر ہم لوگوں کا بھی حق ہے۔آپ نے جواب دیا کہ ”میرے ذاتی مال میں تمھارا حق ہوسکتا ہے مگر اس میں اتنی گنجایش نہیں اور بیت المال میں تمھارا حق اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا برک غماد کے آخری حدود میں رہنے والے کا۔بخدا اگر ساری دنیا تم لوگوں کی ہم رائے ہوجائے تو ان پر اللہ کا عذاب نازل ہو“۔

غرض آپ نے خاندان کے سارے وظائف بند کر دیے۔ شاہی شان وشوکت کے تمام سامان ختم کر دیے۔ جب شاہی اصطبل کے داروغہ نے آپ سے اصطبل کے اخراجات مانگے تو آپ نے حکم دیا کہ تمام سواریوں کو بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔ آپ نے خود اپنا تمام ذاتی سامان بیچ کر قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔

ناروا ٹیکسوں کا خاتمہ

عبدالملک اور ولید کے زمانے میں حجاج بن یوسف بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے نومسلموں سے بھی جزیہ وصول کرتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا اور ایک عام حکم جاری کر دیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ چھوڑ دیا جائے۔ اس پر صرف مصر میں اتنے آدمی مسلمان ہوئے کہ مصر کے گورنر نے آپ کو لکھا کہ آپ کے اس حکم کی وجہ سے اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ آمدنی گھٹ گئی ہے اور مجھے قرض لے کر تنخواہیں ادا کرنی پڑی ہیں۔ آپ نے اسے لکھا کہ (مسلمان ہونے والوں پر سے) جزیہ بہر حال موقوف کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے نہ کہ تحصیل دار۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے تمام ناجائز ٹیکس، خراج اور چنگیاں بند کر دیں۔ آپ نے دفتری اخراجات میں بھی تخفیف کر دی۔ تمام عمال کو ہدایت بھیجی کہ ''قلم باریک کر دو اور رگھا ہوا لکھو اور ایک ہی پرچے پر بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لیے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے''۔

آپ نے عوام کی دیکھ بھال کی طرف توجہ کی۔ ملک میں جتنے مجبور اور معذور اشخاص تھے ان سب کے نام رجسٹروں میں درج کر کے ان کے وظیفے مقرر کر دیے۔ اس سلسلے میں کسی عامل سے اگر ذراسی غفلت بھی ہوتی تھی تو سخت تنبیہ فرماتے تھے۔ ان کے قرضوں کی ادائیگی کے لیے ایک مستقل مد قائم کی۔ شیر خوار بچوں کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقرا اور مساکین کو پکا پکایا کھانا مل جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو آپ نے غربا میں صدقات تقسیم کرنے کے لیے کچھ بھیجنا چاہا۔ اس نے عذر کیا کہ میں ناواقفیت کی وجہ سے وہاں کے امیر وغریب میں تمیز نہیں کر سکتا۔ فرمایا: ''جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دینا''۔

ناجائز آمدنیوں کے سدِ باب، لوٹ مار اور رشوت کے انسداد اور صدقات وخیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام آسودہ حال ہو گئے۔ افلاس اور غربت کا خاتمہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ صدقہ قبول کرنے والے نہ ملتے تھے۔

بیورو کریسی کی تطہیر

اس کے ساتھ ہی آپ نے ظالم، راشی اور بدعنوان عہدہ داروں کی طرف توجہ فرمائی۔ حجاج بن یوسف کے پورے خاندان کو جو سب سے زیادہ ظالم تھا، یمن میں بھیج دیا اور وہاں کے گورنر کو لکھا کہ میں تمھارے پاس آلِ عقیل کو بھیج رہا ہوں جو عرب میں بدترین خاندان ہے۔ ان کو اپنے حدودِ حکومت میں منتشر کر دو۔ ایک گورنر عبدالحمید کو لکھا کہ وسوسۂ شیطانی اور حکومت کے ظلم وستم کے بعد انسان کی بقا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔

اموی خلفا کے زمانے میں ذرا ذرا سی بدگمانی پر سنگین سزائیں دے ڈالنا ایک معمولی بات تھی۔ آپ نے یہ طریقہ بالکل بند کر دیا۔ موصل میں چوری وغیرہ کی وارداتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ وہاں کے گورنر نے لکھا کہ "جب تک لوگوں کو شبہے میں نہ پکڑا جائے اور سزا نہ دی جائے، اس وقت تک یہ وارداتیں بند نہیں ہو سکتیں"۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ "صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ کرو۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح نہ کرے"۔

خراسان کے گورنر نے لکھا کہ اہل خراسان کی روش نہایت خراب ہے۔ ان کو کوڑے اور تلوار کے سوا کوئی چیز درست نہیں کر سکتی۔ اگر امیر المومنین مناسب سمجھیں تو اس کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ نے گورنر کو جواب میں لکھا کہ "تمھارا یہ کہنا کہ اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے سوا کوئی اور چیز درست نہیں کر سکتی، بالکل غلط ہے۔ ان کو عدل اور حق درست کر سکتے ہیں۔ انھی کو جہاں تک ہو سکے عام کرو"۔

ظلم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عمال اشیا کے نرخ گھٹا کر کم قیمت پر خرید لیا کرتے تھے۔ آپ نے قانون بنا دیا کہ کوئی عامل کسی شخص کا مال کم قیمت پر نہیں خرید سکتا۔

کسی حکمران کے عدل وانصاف اور ظلم وجور کے جانچنے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ وہ اپنی ماتحت اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور بہترین دور تھا۔ آپ نے اپنے گورنروں کو حکم دے رکھا تھا کہ "ذمیوں کے ساتھ نرمی برتو اور ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے اس کی کفالت کا انتظام کرو۔ اگر اس کا کوئی صاحبِ حیثیت رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو---ورنہ بیت المال سے انتظام کرو"۔

دین و سیاست کی دُوئی کا خاتمہ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جس طرح حکومت کا سیاسی ڈھانچہ بدلا اور اس کے ہر شعبے میں اصلاحات کیں' اسی طرح خالص دینی امور کی طرف بھی توجہ کی۔

اموی دَور میں اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا۔ اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی نہ فرصت ہوتی تھی نہ اہلیت۔ نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے' ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے۔ یہ کام علما اور محدثین کا سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دُوئی کو مٹایا اور انھوں نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی سول حکام اور فوجی افسروں کو مفصل خطوط اور فرمان لکھے جو انتظامی سے زیادہ دینی اور اخلاقی نوعیت کے ہوتے تھے اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ اور نصیحت کی روح ہوتی تھی۔ اس باب میں ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ عاملوں اور گورنروں کے نام جو فرامین خلافت سے ان کے زمانے میں جاری ہوتے تھے' ان کے متعلق مؤرخین کا بیان ہے کہ اُن میں یا تو کسی ظلم کا ازالہ ہوتا یا کسی سنت کے زندہ کرنے کا حکم' یا کسی بدعت کے مٹانے کا فرمان' یا کسی کا وظیفہ مقرر کرنے کی ہدایت ہوتی' یا کوئی نیکی کی بات' اور یہ اس وقت تک ہوتا رہا جب تک وہ زندہ رہے۔

اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں انھوں نے ایک سرکلر جاری کیا جس میں فرماتے ہیں:

> **اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں' جو اُن پر عمل کرے گا اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی اور جو عمل نہیں کرے گا' اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمھیں اس کی تعلیم دوں گا اور تمھیں ان پر چلاؤں گا۔ اگر اس سے پہلے میرا وقت آ گیا تو میں تمھارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہوں"۔**

جزیرہ کے گورنر کو نماز کی تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **نماز کے وقت تمام کام چھوڑ دو کیونکہ جس شخص نے نماز کو ضائع کر دیا' وہ دیگر فرائض اسلام کا سب سے زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔**

عام بگاڑ کے سبب سے دوسرے تعیّشات کے ساتھ شراب نوشی کا رواج بھی معاشرے میں ہو چلا تھا۔ آپ نے تمام عمال کے نام حکم جاری کر دیا کہ کوئی ذمی مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائے اور شراب کی دکانوں کو حکماً بند کر دیا جائے۔

آپ ہر وقت عوام پر نظر رکھتے تھے اور جہاں کوئی خرابی پیدا ہوتی تھی' اس کا تدارک کرتے تھے۔ آپ نے تمام عمال کو ایک فرمان بھیجا' جس کا خلاصہ یہ ہے:

مجھے معلوم ہوا ہے کہ بیوقوفوں کی عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح موت کے وقت بال کھولے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ اس نوحہ و ماتم پر قدغن لگاؤ۔ اہل عجم چند چیزوں سے جنھیں شیطان نے ان کی نگاہ میں محبوب کر دیا تھا' دل بہلاتے تھے۔ مسلمانوں کو اس لہو لعب اور راگ باجے سے روکو اور جو نہ مانے اسے اعتدال کے ساتھ سزا دو۔

اشاعتِ اسلام

لوگوں کے اعمال کے ساتھ ساتھ آپ کو ان کے عقائد کی بھی فکر رہتی تھی۔ آپ کے زمانے میں معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے قضا و قدر کا مسئلہ چھیڑ رکھا تھا اور عوام کو لایعنی بحثوں میں اُلجھا رہے تھے۔ آپ نے انھیں بلا کر غلط عقائد سے توبہ کرائی اور علما کو لکھا کہ وہ ان خیالات کو قبول نہ کریں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی حکومت کے رقبے میں توسیع کے بجائے خود اسلام کی توسیع و اشاعت کو مقصود قرار دیا اور اپنی ساری توجہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کر دی اور اس سلسلے میں ہر طرح کے مادی و اخلاقی ذرائع استعمال کیے۔ فوجی افسروں کو ہدایت کی کہ وہ رومیوں کی کسی جماعت سے اس وقت تک جنگ نہ کریں جب تک کہ انھیں اسلام کی دعوت نہ دے لیں۔ تمام عمال کو حکم تھا کہ وہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ جو ذمی اسلام قبول کر لے' اس کا جزیہ معاف کر دیں۔ آپ کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ صرف ایک صوبے خراسان میں ۴ ہزار ذمی مسلمان ہو گئے۔ افریقہ اور اندلس کے تازہ مفتوحہ علاقوں میں اشاعتِ اسلام کی طرف آپ نے خاص طور پر توجہ فرمائی اور اپنے دستِ مبارک سے دعوتی خطوط لکھ لکھ کر روانہ کیے۔ علامہ بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں: ''پھر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور آیا تو انھوں نے اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر کو مغرب کا گورنر مقرر کیا۔ انھوں نے نہایت عمدہ روش اختیار کی اور بربروں کو اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کے نام دعوتی خطوط لکھے۔ اسماعیل نے جب یہ خطوط ان کو پڑھ کر سنائے تو مغرب پر اسلام غالب آ گیا''۔

اس طرح آپ نے سندھ کے حکمرانوں اور زمین داروں کو بھی دعوتی خطوط لکھے۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا۔

اشاعت اسلام کے لیے ضروری تھا کہ خود علم دین کی طرف توجہ کی جاتی۔ اس سلسلے میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ حدیث کی تدوین تھا۔ اپنے زمانے کے ایک بڑے عالم ابو بکر بن حزم کو تدوین حدیث کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ۔ اس لیے کہ مجھے خطرہ ہے کہ علما رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا''۔

اس پر بھی آپ کو اطمینان نہیں ہوا تو اپنی سلطنت کے تمام عہدے داروں کے نام فرمان جاری کیا کہ ''رسولؐ اللہ کی احادیث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرو''۔

پھر اس پر اکتفا نہیں کیا۔ علما کو اشاعت علوم کی طرف متوجہ کیا۔ ایک فرمان میں آپ لکھتے ہیں: ''لوگوں کو چاہیے کہ عام طور پر علم کی اشاعت کریں اور تعلیم دینے کے لیے حلقۂ درس قائم کریں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ بھی جان لیں کیونکہ علم اس وقت تک برباد نہیں ہوتا جب تک کہ اسے مخفی نہ رکھا جائے''۔

حمص کے گورنر کو لکھا: ''جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر رکھا ہے ان میں سے ہر ایک کو جس وقت میرا خط پہنچے بیت المال سے ۱۰۰ دینار دو تاکہ وہ لوگ اس حالت کو قائم رکھ سکیں''۔

حضرت نافع کو جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام اور مدینہ منورہ کے محدث اور فقیہہ تھے خاص طور پر مصر بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کو فقہ اور حدیث کی تعلیم دیں۔

ایک اور تبدیلی جو آپ کے عہد میں آئی وہ یہ تھی کہ آپ کے پیش رو اموی خلفا کے گرد شاعروں' خوشامدیوں' سازندوں اور گویوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ آپ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے اپنے زمانے کے مشہور تابعین اور علما کو اپنے اردگرد جمع کیا۔ یہی لوگ درحقیقت آپ کی شوریٰ تھے جن سے آپ روزمرہ کے معاملات میں مشورہ لیتے تھے۔ رفقائے کار اور اربابِ صحبت میں جن اوصاف کا ہونا آپ کے نزدیک ضروری تھا اُن کی آپ نے خود تصریح فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پہلی صفت یہ ہے کہ:

۱- اگر میں انصاف کی راہ نہ پاؤں تو وہ میری رہنمائی کرے۔
۲- نیکی کے کاموں میں میرا مددگار ہو۔
۳- جو لوگ مجھ تک اپنی حاجت نہیں پہنچا سکتے وہ مجھ تک ان کی حاجت پہنچائے۔
۴- میرے پاس کسی کی غیبت نہ کرے۔
۵- امانت دار ہو۔

الناس علٰی دین ملوکھم

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے امورِ خلافت کے انتظام و انصرام میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنے لیے نمونہ بنایا تھا۔ چنانچہ آپ حضرت فاروق اعظمؓ کے پوتے حضرت سالمؒ بن عبداللہ بن عمر کو جو خود ایک ممتاز تابعی تھے' ایک خط میں لکھتے ہیں کہ: ''اگر اللہ مجھ کو استطاعت دے تو میں رعایا کے معاملات میں عمرؓ بن خطاب کی روش اختیار کروں۔ اس لیے تم میرے پاس اُن کی وہ تحریریں اور فیصلے بھیج دو جو انھوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کے بارے میں کیے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو میں ان کے نقشِ قدم پر چلوں گا''۔

حضرت عمرؓ بن خطاب کی پیروی کی یہی رُوح ہے جو اُن کے ہر کام میں جاری و ساری تھی۔ جس بے خوفی اور جانفشانی سے انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں' احیائے نظامِ اسلامی کا کٹھن فریضہ ادا کیا وہ سب ان کی اسی نیت کا فیض تھا۔ دو سال کی مختصر سی مدتِ خلافت میں کتنا عظیم الشان تغیر واقع ہو گیا تھا' اس کا اندازہ آپ اس سے لگایئے کہ مشہور مدنی امام اور حضرت ابوبکرؓ کے پوتے حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر نے آپ کی خلافت کا رنگ دیکھ کر فرمایا تھا: الیوم ینطق من کان لا ینطق، اب وہ بھی بولیں گے جو پہلے نہیں بولتے تھے۔